جلد چہارم

ایسی خلوت ہے کہاں

مارچ 1996

سے
میر احمد نوید

انتساب

عفت نوید کے نام

ہوش مندوں نے مجھے دیوانہ کیا جبکہ میری دیوانی عفت نوید مجھے ہوش میں لائی یعنی میرا سب کچھ میری شریکِ حیات عفت نوید کے نام ہے جو میرا جوگ لے کر عفت زمان سے عفت نوید ہوئی اور جس نے ساری زندگی زمانے کے دُکھوں کے ساتھ ساتھ میرا جنون بھی سہا جبکہ مجھے اور میرے بچوں کو ایک کامیاب زندگی عطا کی اور اپنی تحریروں سے انسانوں میں بیداری اور شعور پیدا کیا۔

نوؔید اُس کا نوؔید جس کی عفت اور عفت اُس کی عفت جس کا نوؔید یعنی جو نوید کا نہیں وہ عفت کا نہیں اور جو عفت کا نہیں وہ نوؔید کا نہیں۔

اُس طرف دیکھتی دنیا کے تحیّر سے اِدھر
حیرتِ عشق نے معشوق کو عاشق دیکھا

میر احمد نوؔید

اپنے بھتیجے علی رَوِش کے لیے

اے مِرے تازہ نفس اے مِرے سیارۂ نَو
تیرے چہرے سے ٹپکتا ہے مہ و مہر کا نُور
تیری آنکھوں میں تر و تازہ جہانوں کا شعور
تیرے رونے میں ہے پوشیدہ نوائے ہابیلؑ
مسکراہٹ ہے کہ روشن ہے فضا میں قندیل
اے مِرے تازہ نفس اے مِرے سیارۂ نَو

تو خلاؤں کا مکیں ہے تِرا ہونا ہے الگ
تیرا امروز الگ ہے تِرا فردا ہے الگ
میری دنیا سے سِوا ہے تِری دنیا کا شعور
تیرا پنہاں بھی الگ ہے تِرا پیدا ہے الگ
اے مِرے تازہ نفس اے مِرے سیارۂ نَو

یہ جو ہر گام پہ بکھرے ہوئے سیّارے ہیں
تجھ سے تابندہ ستارے کے لیے گھر ہوں گے
قربتیں ساری تِرے دل میں سمٹ آئیں گی
فاصلے سارے تِرے قد کے برابر ہوں گے
یہ ستارے جنہیں چھونے کی تمنا ہے تجھے
کل تِری راہ میں مانندِ گُلِ تر ہوں گے
اے مِرے تازہ نفس اے مِرے سیارۂ نو

مَیں

مَیں سے آغاز ہوئی خلوتِ بزمِ امکاں
مَیں کے اِس آئنہ خانے کا ہے مَیں ہی یزداں
مَیں نے ظاہر کیا خود کو تو بنے ارض و سما
مَیں ہی آدم کی شروعات ہے مَیں ہی شیطاں

مَیں نہ ہوتی تو نہ ہوتا کہیں اشیا کا وُروُد
مَیں کا آئین ہی ہے شرحِ عدم شرحِ وجود

مَیں کا امکان ہے یہ عالمِ صد آب و سراب
مَیں ہے سب میں وہ سمندر ہو کہ دریا کہ حباب
سامنے مَیں کے یہاں زانوئے دل تہہ کر کے
مَیں ہی پڑھ سکتی ہے مکتب مَیں فقط میں کی کتاب

زیرِ شمشیر الف مَیں ہی تو سر رکھتی ہے
یہ نَظر رکھتی ہے ہونے کی خبر رکھتی ہے

مَیں ہے اِس دہر کی ویران سرائے کا چراغ
مَیں کی حیرت میں نظر آتا ہے گم مَیں کا دماغ
شمع ہے دُود ہے پروانہ ہے یا راکھ ہے میں
ڈھونڈتی ہی رہی مَیں پا نہ سکی مَیں کا سراغ

مَیں نہ نادیدہ ہے ہر چشم کو نے دیدہ ہے
یہ وہ بیدار کہ ہر ذات میں خوابیدہ ہے

مَیں کی ہستی ہی میں موجود ہے یاں مَیں کا عدم
مَیں کی ہی آنکھ سے دیکھو تو نظر آئے قِدم
ذات ہی میں نہیں مَیں ذات سے باہر بھی ہے مَیں
مَیں سے اُٹھتے ہیں قدم مَیں ہی میں پڑتے ہیں قدم

مَیں سے آباد ہے ہر گوشۂ میخانۂ ہست
مَیں نظر آتی ہے در ساغر و پیمانۂ ہست

کون لائے گا سرِ دہرِ فنا 'مَیں' کی مثال
چشمِ خیرہ کو نظر آئے گا کیا 'مَیں' کا جمال
'مَیں' میں پوشیدہ ہے ہر رازِ شہود و مشہود
'مَیں' ہی ہر ذرّۂ نادیدہ میں ہے حسن و جلال

'مَیں' جو اِس شان سے اشیا میں نظر آتی ہے
آنکھ پڑتی ہے تو حیرت سے ٹھہر جاتی ہے

آپ عاشق ہے یہ 'مَیں' آپ ہی محبوب یہ 'مَیں'
آپ طالب ہے یہ 'مَیں' آپ ہی مطلوب یہ 'مَیں'
بچ ہی سکتی نہیں 'مَیں' آپ میں 'مَیں' کی زد سے
آپ غالب ہے یہ 'مَیں' آپ ہی مغلوب یہ 'مَیں'

ایک تنہائی کا صحرائے لق و دق ہے یہ 'مَیں'
'مَیں' سے آگاہ ہو گر 'مَیں' تو انا الحق ہے یہ 'مَیں'

چمنِ دہر میں یاں جزو بھی مَیں کُل بھی ہے مَیں
مَیں کے آلام پہ ہنستا ہے جو وہ گُل بھی ہے مَیں
نیستی سے گلے مل کر بہ صد اندوہ و ملال
مَیں کی ہستی پہ جو روتی ہے وہ بلبل بھی ہے مَیں

غور سے دیکھو تو اِس باغ میں ہر جا مَیں ہے
شبنم و برگ و گل و شاخ سے پیدا مَیں ہے

عیب موجود جہاں ہے وہاں بے عیب ہے مَیں
دوسرا مَیں سا نہیں کوئی بھی لاریب ہے مَیں
کیا کرشمہ ہے فسوں کاری و پرکاری کا
کہ نظر آتی ہے ہر شے میں مگر غیب ہے مَیں

اتنے بکھراؤ میں موجود ہے ترتیب کا حسن
دیکھ اے چشم یہ ہے غیب کی تہذیب کا حسن

مَیں وہ سودا ہے جسے سود و زیاں کچھ بھی نہیں
مَیں وہ مستی جسے اندیشۂ جاں کچھ بھی نہیں
وقت ہر چند مٹاتا ہے ہر اِک شے کو مگر
مَیں ہے موجود جہاں وقت وہاں کچھ بھی نہیں

یہ وہ شے ہے کہ ہے ہر قیدِ مکاں سے آزاد
یہ وہ آزادہ و خودبیں کہ زماں سے آزاد

مَیں کی خلوت میں گم آفاق کی تنہائی ہے
مَیں کی خلوت تو خود اِک انجمن آرائی ہے
مَیں کے ظاہر سے پہاڑوں کی سی ہیبت ہے عیاں
مَیں کے باطن میں سمندر کی سی گہرائی ہے

مَیں جب آفاق کے پیالے سے چھلک جاتی ہے
ذات کے آئینہ خانے سے جھلک جاتی ہے

خواب میں چشم بھی میں خواب کی تعبیر بھی مَیں
رنگ بھی میں ہے مصور بھی میں تصویر بھی مَیں
مَیں کی حد سے کوئی جائے گا نکل کر کیسے
پاؤں مَیں ہے کہ جنوں مَیں ہے کہ زنجیر بھی مَیں

اِسی زنجیر کی کڑیاں ہیں مہ و مہر و فلک
اِسی زنجیر کے قیدی بشر و جن و ملک

دل اگر مَیں ہے تو دل رب ہے کہ رب خود مَیں ہے
مَیں مسبب ہی نہیں مَیں کا سبب خود مَیں ہے
مَیں ہے کیا عشق جو کرتے ہیں وہ سب جانتے ہیں
کاسۂ عشق میں یاں مَیں کی طلب خود مَیں ہے

مَیں تو اِک بحر ہے کاسے میں سمائے کیسے
آپ سے جائے کہاں آپ میں آئے کیسے

پردۂ خاک سے پیوند ہے پردہ مَیں کا
ذرّے ذرّے میں نظر آتا ہے چہرہ مَیں کا
مَیں کی حد کوئی نہیں حد سے یہ بالا ہے کہ ہے
وسعتِ انفس و آفاق پہ سایہ میں کا

مَیں ہی وسعت کدۂ ذات میں مَیں کی حد ہے
موت کیا چیز کہ یہ موت تو مَیں کا رد ہے

مَیں ہے وہ راز کہ خود مَیں کا ازل ہے مَیں سے
غایتِ علت و معلول و علل ہے مَیں سے
شمع کی لَو ہی میں جس طرح سے پوشیدہ ہے دُود
ہر تجلی میں اسی طرح خلل ہے مَیں سے

مَیں ہے خود آپ خبر مَیں کی خبر کوئی نہیں
ہائے یہ رمز یہاں جانتا پر کوئی نہیں

جلوہ سامانیِ بیرون و دروں بھی مَیں ہے
عشق بھی مَیں ہے خرد مَیں ہے جنوں بھی مَیں ہے
مَیں کو تخلیق کیا جس نے وہ مَیں ہے خود بھی
یعنی مخفیِ ازل کن فیہ کوں بھی مَیں ہے

مَیں کو تخلیق کیا رب نے جہاں سے پہلے
اس کو ترتیب دیا جسم میں جاں سے پہلے

مَیں کے جلووں کی فقط طالبِ دیدار ہے مَیں
سرِ بازارِ جنوں مَیں کی طلب گار ہے مَیں
ایک رکھتی ہے تو اِک پاؤں اُٹھا لیتی ہے
جتنی آزاد ہے میں اتنی گرفتار ہے مَیں

اختیار اس کا کہیں جبر سے آزاد نہیں
یہ ہے وہ قید کہ جس کی کوئی میعاد نہیں

مَیں زمیں مَیں ہے زماں مَیں ہے مکاں مَیں ہے مکیں
باغِ ہستی میں نہیں کوئی بھی گل مَیں سا حسیں
کوچۂ حسن میں مَیں گھومتی ہے کاسہ بدست
کاش مل جائے اِسے بھیک میں چشمِ خودبیں

خود کو دیکھے تو کُھلے اس پہ کہ حیرت کیا ہے
مَیں کی یہ جلوہ گہِ کثرت و وحدت کیا ہے

ہاں سنو عبد بھی مَیں عبد کا معبود بھی مَیں
ذاتِ پروانہ بھی مَیں شمع بھی مَیں دود بھی مَیں
مَیں کی دہلیز پہ ہے سجدہ کناں مَیں کی جبیں
خالق و خلق بھی مَیں ساجد و مسجود بھی مَیں

مَیں اگر عبد کی معبود کی مَیں سے مل جائے
چاک در چاک یہ آدم کا گریباں سِل جائے

مَیں لگاتی ہے یہ نعرہ پسِ ہر نعرۂ ھُو
تُو مِرا تُو ہے سرِ ہستیِ دل مَیں ترا تُو
مَیں جب اِک عالم اثبات میں مَیں سے گزری
تُو کی صہبا سے لبالب ہوا تب مَیں کا سبو

تو میں رہتے تھے جو گم آپ میں دونوں مَیں تھے
رفت یا بود نہ تھے عشق میں دونوں ''ہیں'' تھے

بارِ ہفت آسماں سر پر یہ لئے گھومتی ہے
اپنی ہی ذات میں گم شام و سحر جھومتی ہے
کہکشاؤں سے بھی آگے ہے کہیں اِس کا گزر
کبھی افلاک کبھی خاکِ زمیں چومتی ہے

یہ نہ معبد میں نہ مندر میں نہ درگاہ میں ہے
یہ تو اِک سیل ہے اور دل کی گزرگاہ میں ہے

مَیں سے خود کو نہ جدا کر کہ خدا ہے اِس میں
مَیں سے پیوست ہی رہ رازِ بقا ہے اِس میں
مَیں سے ملنے کی تمنا ہے تو اے پر توِ ذات
خود کو خاشاک بنا سیلِ فنا ہے اِس میں

خود کو پروانہ تو کر ہستیِ دائم ہے یہ مَیں
شمعِ یزداں ہے یہ مَیں شعلۂ قائم ہے یہ مَیں

وقت

وقت کُن ہے تو تغّیرِ فیکوں کے مانند
کب فسوں کوئی تغّیر کے فسوں کے مانند
وقت سرخیِ تغّیر لیے بس دم ہمہ دم
دوڑتا پھرتا ہے شریانوں میں خوں کے مانند

ناتمامی کا وہ عالم ہے جنوں کی ہر دم
چاہیے اِس کو صدا کُن فیکوں کی ہر دم

وقت نے رات سے دن دن سے نکالی ہے یہ رات
وقت ہی مرکزِ جدلّیتِ نور و ظلمات
یہ ہمیشہ سے ہمیشہ کے لیے ہے دائم
یہ صفت اور کسی کی نہ کسی کو یہ ثبات

ہوئے کتنے ہی ازل اِس کے ابد سے پیدا
آج کتنے ہوئے کل اِس کے ابد سے پیدا

وقت ہی سے دلِ ہر ذرّہ میں ہے رستا خیز
قطرہ و بحر میں یہ موجزن آہستہ و تیز
ساغرِ چشم میں اِس کی وہ تغّیر ہے کہ بس
گاہ الفت سے ہے پرُ گاہ غضب سے لبریز

نار و نور اِس کی تجلّی میں سمائے ہوئے ہیں
وقت کے ہاتھ مہ و مہر اُٹھائے ہوئے ہیں

بے قراری ہی میں مضمر ہے تغّیر کا قرار
یہ فنا ہے، یہ بقا ہے، یہ خزاں ہے، یہ بہار
آج جو خاک ہے کہیے گا اسے کل گلِ نو
آج جو ہے گلِ نو کل اُسے کہیے گا غبار

وقت خود نقش بناتا بھی مٹاتا بھی ہے
نظر آتا ہے کہ آتا بھی ہے جاتا بھی ہے

قہر و غیض و غضب و ہیبت و رعب و اجلال
تیز و طرّار و کرخت و یم و طوفان و وبال
دوش و فردا ہیں جو اِس طرح سے ہنگامہ بہ دوش
اِس تلاطم میں کہاں پاؤں ٹکا سکتا ہے حال

وقت کے سیل میں ماضی ہے کنارِ فردا
حال کچھ بھی نہیں جز مشتِ غبارِ فردا

وقت کے سیل کی ہستی میں کسی کو نہیں تاب
دریا چھپتا ہے سمندر میں تو دریا میں حباب
پشتِ پا مار کے جس کو بھی گزرتا ہے یہ وقت
اس کو سینے سے لگاتی ہے فنا بڑھ کے شتاب

کشتۂ وقت کی منزل ہے فنا کا آغوش
اور پردے میں فنا کے ہے بقا کا آغوش

وقت قطرہ بھی ہے دریا بھی ہے قلزم بھی ہے
وقت کے ساتھ تغّیر کا تلاطم بھی ہے
ابھی قطرہ، ابھی دریا، ابھی قلزم، یہ کیا
وقت لگتا ہے کہ موجود بھی ہے گم بھی ہے

اس کی موجوں میں روانی کے سوا کچھ بھی نہیں
کیا ملا تشنہ دہانی کے سوا کچھ بھی نہیں

وقت بنیاد بھی سایہ بھی ہے دیوار بھی ہے
وقت خامہ بھی ہے نقطہ بھی ہے پرکار بھی ہے
دائرہ وار ہے مجموعۂ تکمیل و تضاد
آتش و آب بھی ریشم بھی ہے تلوار بھی ہے

عقل انگشت بہ دنداں ہے کہ یہ وقت ہے کیا
بے بس و ششدر و حیراں ہے کہ یہ وقت ہے کیا

وقت ہے چاک میں بھی گردشِ کوزہ میں بھی ہے
وقت ذرّے میں بھی ہے وسعتِ صحرا میں بھی ہے
وقت کس میں نہیں موجود بہ قدرِ موجود
وقت قطرے میں بھی موجود ہے دریا میں بھی ہے

ذرّہ صحرا سے نہ دریا سے جدا قطرہ ہے
ہاں مگر وقت مِلاتا ہے جدا کرتا ہے

یمِ آب ایک طرف ہے یمِ وقت ایک طرف
سیلِ خوں ایک طرف ہے دمِ وقت ایک طرف
جنبشِ پا نظر آئے نہ ہی نقشِ کفِ پا
رمِ نور ایک طرف ہے رمِ وقت ایک طرف

یعنی رفتار ہے رفتار ہے رفتار ہے وقت
ہائے آزاد ہے اتنا کہ گرفتار ہے وقت

وقت اِک سیل ہے اور وقت کا یہ سیل رواں
سب بہائے لیے جاتا ہے زمیں ہو کہ زماں
آمد و رفتِ تغیّر کی دھمک سے ہمہ وقت
برلبِ ہستیِ اشیا الحفیظ و الاماں

حالتِ خوف چھپائے سے بھی کب چھپتی ہے
شب میں چھُپتا ہے یہ دن، دن میں یہ شب چھُپتی ہے

دیکھ یہ عالمِ اشیاء ہے تہہِ کُن فیکوں
وقت ہی ظاہر و باطن ہے چہ بیروں چہ دروں
موجۂ وقت سے آگے نہ جنوں ہے نہ خرد
بے سکوں ہے یہ جہاں بس حَرَکت کو ہے سکوں

اِسی حرکت سے ہی گردش میں زمیں ہے ہر دم
مہر کو جس جگہ ہونا تھا وہیں ہے ہر دم

عرصۂ کون و مکاں ہو کہ دمِ لوح و قلم
چوبِ منبر ہو کہ ہو دودِ اگردانِ صنم
مشعلِ مندر و درگاہ کہ قندیلِ مزار
قمقمہ ہائے کلیسا ہوں کہ ہو شمعِ حرم

سب میں پیدا و نہاں وقت کا یہ سیل رواں
کس کو دیتا ہے اماں وقت کا یہ سیل رواں

وقت چاہے تو ابھی بستیِ کہنہ دے اجاڑ
ڈال دے نیشِ تغیّر سے فصیلوں میں دراڑ
یہ جو قائم ہیں تو یہ وقت کی مہلت ہی سے ہیں
وقت چاہے تو ابھی ریت نہ بن جائیں پہاڑ

یہ جو چاہے تو ہَوا کیا ہے زمیں تھم جائے
جو جہاں ہے وہیں رہ جائے وہیں تھم جائے

موجِ سرکش کے تئیں ممکن و موجود ہے کیا
کار و بازارِ زیاں کیا خلشِ سود ہے کیا
تیز رفتاریِ سیلابِ تغیّر کے تئیں
شمعِ صد رنگ ہے کیا شعلہ ہے کیا دُود ہے کیا

تابشِ انجمِ معدوم سے ظاہر ہے فنا
کتنا روشن ہو کوئی نوبتِ آخر ہے فنا

گردشِ ساغر و پیمانہ و افلاک ہے کیا
گِل ہے کیا کوزہ ہے کیا حلقہ گہِ چاک ہے کیا
تیزی و تندیِ رفتارِ فنا کے آگے
گل ہے کیا برگ ہے کیا شاخ ہے کیا تاک ہے کیا

ہے تغیّر کا وہ عالم یہ ابھی ہیں ابھی نئیں
ہاں فقط وقت ہے پیہم یہ ابھی ہیں ابھی نئیں

مہ و خورشید ہیں کیا ثابت و سیّار ہیں کیا
بنتی مٹتی ہوئی تہذیبوں کے آثار ہیں کیا
زد پہ آئیں جو تغیّر کی تو ہیں مشتِ غبار
گھر ہیں کیا شہر ہیں کیا کوچہ و بازار ہیں کیا

وہ تغیّر ہے کہ آباد یہاں کوئی نہیں
وقت کے دام سے آزاد یہاں کوئی نہیں

ہاں فقط عشق ہے آزاد سرِ عرش و زمیں
جس کی حد ہے کوئی ظاہر نہ کنارہ ہے کہیں
عشق خود سیل ہے، کیا اس کے تئیں وقت کا سیل
عشق ٹھہرا ہے جہاں وقت وہاں کچھ بھی نہیں

عشق کا اور زماں ہے یہ زماں ہے کچھ اور
عشق کا اور مکاں ہے یہ مکاں ہے کچھ اور

آئینہ

طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ
گویا حریمِ حسن میں داخل ہے آئینہ
جب آئینہ وجود ہے جب آئینہ شہود
پھر کیا کہیں کہ کس کے مماثل ہے آئینہ

آئینہ کُن ہے اور فیکوں کائنات ہے
وسعت میں اس کی دائرۂ شش جہات ہے

ہے ثبت ہر دوام پہ آئینے کا دوام
یہ رَو بہ رَو قطار میں چہروں کا اژدھام
اِک رُو نہ سطح وقفے کے قابل نظر پڑی
دیکھا بہ رنگِ آبِ رواں آئنہ تمام

اِک آئنے میں ایک سے چہرے تھے سب رواں
چشم و مژہ و ابرو و رخسار ولب رواں

اِک سیل ہے یہ آئنہ اِس کے سوا ہے کیا
اس رَو میں حال و ماضی و فردا بھلا ہے کیا
اِس کا جواب ڈھونڈتی پھرتی ہے موجِ وقت
پھر بھی ہے یہ سوال وہیں آئنہ ہے کیا

اِس آئنے ہی سے رُخِ خورشید زرد ہے
اِس آئنے کے آگے تو یہ وقت گرد ہے

اِس آئنے کی تاب کوئی لائے کیا مجال
لب کیا ہلیں پلک کا جھپکنا یہاں محال
حیرت ہی کر سکے تو کچھ اِس سے کرے کلام
حیرت ہی پر کُھلے گی یہ خاموشیِ جمال

مانا کہ خامشی کی بہت تہہ دبیز ہے
حیرت تو خامشی سے بھی آگے کی چیز ہے

آئینہ ہی جنوں ہے یہ آئینہ ہی پری
اے چشم آئنے سے گزر یوں نہ سرسری
عریاں ہے اِس کے حسن سے ہیبت جمال کی
پیدا ہے اِس سے خاک کے پُتلے میں تھرتھری

اِس آئنے کے آگے قضا و قدر ہے کیا
اِس آئنے سے آگے بھی کچھ ہے مگر ہے کیا

آئینۂ خرد میں کچھ آتا تو ہے نظر
پر کیا ہے اور کیوں ہے یہ کھلتا نہیں مگر
ہر دم دکھا رہا ہے نیا رنگ آئنہ
اور چشم کہہ رہی ہے برابر دِگر دِگر

یہ چشم کم نہیں ہے یہ آئینہ کم نہیں
اس ربط کے وجود کا کوئی عدم نہیں

آئینہ وہ ہے جس میں کہ چہرہ دکھائی دے
ماضی کو دیکھنے چلیں، فردا دکھائی دے
آئینہ وہ ہے جس میں تغیّر کا ہو سراغ
قطرے کو دیکھنے چلیں، دریا دکھائی دے

خیرہ ہو چشمِ دل وہ تماشا نظر پڑے
ہو آئنہ ہی آئنہ جس جا نظر پڑے

حسرت ہے جس کی باغ کو وہ گل ہے آئنہ
اِک نور ہے کہ جس کا تسلسل ہے آئنہ
وہ سیلِ رنگ ہے کہ ٹھہرتی نہیں نگاہ
ہے جزو گر کہیں تو کہیں کل ہے آئنہ

دیکھو تو اور ہی ہے تماشائے آئنہ
طوطی کے لب پہ ہے ہمہ دم ہائے آئنہ

شفّاف اس قدر ہے کہ شیشہ ہے آئنہ
یوں ہے کہ سانس لینے سے دھندلا ہے آئنہ
اپنی چمک میں حیرتِ یوسفؑ لیے ہوئے
اِک عمرِ انتظارِ زلیخا ہے آئنہ

یہ بات صرف یوں ہی نہیں بلکہ یوں بھی ہے
آئینہ عشق بھی ہے خرد بھی جنوں بھی ہے

آئینہ دیکھنا ہمہ وقت اِک وبال ہے
آئینہ دیکھنا ہمہ وقت اِک کمال ہے
ماضی ہے چشمِ ہوش کو آئینۂ جہاں
چشمِ جہاں نما کو تماشائے حال ہے

جو دیکھتی ہے چشم تماشا ہے گم کہیں
ماضی کی تہہ میں عرصۂ فردا ہے گم کہیں

آئینہ تہہ بہ تہہ ہے تری چشم تہہ بہ تہہ
آئینہ گر خموش ہے تو بھی خموش رہ
آئینے کے سوال کا حیرت سے دے جواب
اس سیلِ خامشی میں خموشی کے ساتھ بہہ

اپنی فنا ثباتِ تغیّر میں گم تو کر
تو خود کو آئنے کے تحیّر میں گم تو کر

ہے آئینے کی تہہ میں فلک آئنے کو دیکھ
جھپکے نہ خیرگی سے پلک آئنے کو دیکھ
اِس آئینے سے خود کو بھی تو آئینہ بنا
شفاف آپ ہونے تلک آئنے کو دیکھ

دیکھ اِس طرف بھی دیدۂ حیراں اُٹھا کے دیکھ
یہ بارِ آئنہ سرِ مژگاں اُٹھا کے دیکھ

جو دیکھتی ہے چشم دکھاتا ہے آئنہ
کھوئے ہوؤں کو آپ میں لاتا ہے آئنہ
اِک وزن چشمِ محو نظارہ پہ ڈال کر
اِک وزن ہے کہ خود پہ اُٹھاتا ہے آئنہ

تقسیمِ وزن ہی سے تو قائم ہے ربطِ دید
آئینے کو دوام ہے دائم ہے ربطِ دید

آئینے کے ازل کو ابد ہم نے کر دیا
اے وقت جا بھی اب تجھے رَد ہم نے کر دیا
تسبیح کو سبو سے بدل کر خدا کو آج
بالاتر از شمار و عدد ہم نے کر دیا

اُٹھتا نہ تھا یہ بارِ جنوں پر اُٹھا لیا
اس دستِ ناتواں نے یہ ساغر اُٹھا لیا

اے آئینے ہم عشق ہیں جانا ہے کیا ہمیں
چل دیں جو ایک بار تھمے سے نہیں تھمیں
مٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمائیاں
جب آئینے کے سامنے ہم آکے ھُو کریں

ہم آئینے سے اور یہ آئینہ ہم سے ہے
یہ وحدتِ نظارہ ہمارے ہی دم سے ہے

آگے ہو کیا سخن کہ ابھی تک سوال ہے
میں کیا ہوں اور کیا مری تابِ جمال ہے
ہستی کو سوچتا تھا کہ آیا خیالِ دام
پھر آئنہ جو دیکھا تو دیکھا کہ بال ہے

گو آئنہ میں جلوۂ نا پید و پید ہوں
کھلتا مگر نہیں ہے کہ میں کب سے قید ہوں

خوف

خوف کے دم سے ہے عالم میں طلسمِ تگ و تاز
خوف ہے پردہ درِ راز مگر آپ ہے راز
کس سے ہے طائرِ جاں کو حرکت کیا کہیے
خوف پوشیدہ ہے پرَ میں کہ ہے پرَ میں پرواز

گھِر گئی خوف میں یا خوف نے گھیری ہے حیات
پھر گئی خود ہی جدھر خوف نے پھیری ہے حیات

اور انسان سمجھتا ہے یہ ہے اُس کا کمال
یہ تمدّن یہ ترقی یہ چکاچوند یہ حال
کیا کہوں باعثِ غوغائے سگِ فطرت ہے
پسِ تہذیب یہ انساں کا عروج اور زوال

اِس طرف تو سگِ فطرت نے بھگایا ہے اِسے
خوفِ سگ ہے یہ بشر سمت سمجھتا ہے جسے

خوف عزہ و منات و ہبل و لات و الہ
خوف کے بت نے تراشے یہ ثواب اور گناہ
ڈال کر جنّت و دوزخ کی بِنائے بر خوف
خوف نے خوف سے ڈھونڈی یہ نکلنے کی راہ

خوف پر پھر بھی کسی خوف کی طاری رہی رُت
خوف توڑا کیا بت خوف بنایا کیا بت

خوف نے شک کیا پیدا کیا پھر شک سے یقیں
پھر یقیں پر کیا شک اِس میں کوئی شک ہی نہیں
ہائے انساں کے یقیں کی قسم اِس شک کی قسم
کبھی ٹھہری تو کبھی آ گئی گردش میں زمیں

خوفِ جدلّیتِ اوہام بدلتا ہی رہا
بندوبستِ سحر و شام بدلتا ہی رہا

خوف ہی ہے کہ جو کرتا ہے بشر کی تہذیب
بس کہ دیتا ہے یہی داخل و خارج ترتیب
معبد و بت کدہ و مندر و درگاہ و کلس
اِن کی بنیاد میں شامل ہے اِسی کی ترکیب

ہر نفس باعثِ تعمیر و خرابی ہے یہ خوف
گِل تریاق ہے خارِ دمِ افعی ہے یہ خوف

وحی ہے علم ہے الہام ہے حکمت ہے یہ خوف
ایک مجموعۂ اوہام و حقیقت ہے یہ خوف
نڈری پیشِ قدم ہے پسِ اقدام ہے یہ
حرَکت سے جسے نسبت ہے وہ حالت ہے یہ خوف

یہ تحرّک یہ خطِ جہد و عمل خوف سے ہے
ہر نفس تازہ و نو ردّ و بدل خوف سے ہے

تیرِ فطرت کا بشر شست ہے اور کچھ بھی نہیں
نیست کا واہمۂ ہست ہے اور کچھ بھی نہیں
حاصلِ ہمہمۂ آدمِ بے بس کیا ہے
جست کے بعد پھر اک جست ہے اور کچھ بھی نہیں

جست بس دائرۂ خوف بدل دیتی ہے
حالِ پروانہ کہاں طوف بدل دیتی ہے

کب یہ انساں کو خبر ہے کہ وہ کیا چاہتا ہے
گُل کو معلوم نہیں لُو کہ صبا چاہتا ہے
خوف کھاتا ہے مکاں سے در و دیوار سے خوف
اور رہنے کے لئے بھی کوئی جا چاہتا ہے

بے مکانی کا یہی خوف بناتا ہے مکاں
پھر یہی خوفِ مکاں ہے جو گراتا ہے مکاں

یہ خودی اور یہ انا خوف کے پالے ہوئے ہیں
وقت کا وزن جو کاندھوں پہ سنبھالے ہوئے ہیں
ہاں بہ ہر لمحہ بہ ہر گام مسلسل پیہم
آنکھیں آنکھوں میں جو تقدیر کی ڈالے ہوئے ہیں

خوف ہی نے تو یہ پیدا کیے اسبابِ نبرد
جس نے انساں کو سکھائے ہیں یہ آدابِ نبرد

خوف نے اپنی ہی دیوار میں در پیدا کیا
خوف نے بے پریِ خوف سے پرَ پیدا کیا
چھوٹے چھوٹے جو تھے وہ خوف نگلنے کے لیے
خوف نے ایک بہت ہی بڑا ڈر پیدا کیا

کہ یہ ڈر موت کا جو دل میں ہے ڈر ختم کرے
خیر پر لا کے یہ افسانۂ شر ختم کرے

خوف بھر دیتا ہے انساں کے جسد میں قوت
صَرف کرتا ہے پھر انساں کسی مَد میں قوت
اب وہ نیکی میں کرے یا وہ بدی میں کرے صَرف
ہے وہی رشک میں جتنی ہے حسد میں قوت

ڈر محرّک ہے پہ بیگانۂ نیک و بد ہے
یہ تو انساں ہے جو دیوانۂ نیک و بد ہے

جتنا ہے خوف جسے اُتنا بہادر ہے وہ
جس کی قیمت نہیں جز حسن کوئی دُر ہے وہ
خوف جتنا جسے بے خوف کرے عالم میں
اتنا ہی بندۂ آزاد ہے وہ حُر ہے وہ

خوفِ جاں حد سے گزر کر بھی جو بے خوف نہ ہو
پھر تو بس شمع ہو پروانہ ہو اور طوف نہ ہو

حسن کے خوف نے پیدا کیا انسان میں عشق
اِس مسافر کے لیے رکھ دیا سامان میں عشق
جو بھی امکاں ہے وہ امکاں سے نہیں ہے باہر
جب تلک ہے یہاں انسان کے امکان میں عشق

عشق قادر ہے سو ترتیب بدل ہی دے گا
وقت کے ساتھ یہ تہذیب بدل ہی دے گا

شبِ انساں کو یہ امیدِ سحر خوف نے دی
دیکھنے کے لیے فطرت کو نظر خوف نے دی
دامِ فطرت کے فنا کیش ستوں کے نیچے
نہ تھی انساں کے لئے زیست مگر خوف نے دی

یعنی فطرت کو برتنے کا طریقہ بخشا
مَوت کے خوف نے جینے کا سلیقہ بخشا

مَوت کے نام سے خود آتی ہے فطرت کو بھی مَوت
مَوت کے آگے ہے ہر ایک حقیقت کو بھی مَوت
ایک چہرہ ہے کہ ٹھہرے گا مگر مَوت کہ جب
مقتدر کو بھی یہاں مَوت ہے قدرت کو بھی مَوت

مَوت اوّل کو بھی اوسط کو بھی آخر کو بھی ہے
مَوت باطن کو بھی ہے مَوت کہ ظاہر کو بھی ہے

ہے فنا دہر کا مقدور بقا ہو کہ نہ ہو
مَوت خود ایک حقیقت ہے خدا ہو کہ نہ ہو
مَوت ہے جس سے نہیں ہے کسی ہستی کو مفر
راز گو مَوت کا ہستی پہ کھلا ہو کہ نہ ہو

مَوت معلوم ہے بس اور ہے سب نامعلوم
مَوت آئے گی مگر آئے گی کب نامعلوم

آنکھ جتنی بھی کھُلے کم نہ تحیّر ہوگا
مَوت ہے ایسا خلا جو نہ کبھی پرُ ہوگا
زندگی اُس کی حقیقت ہے کہ ویسی ہوگی
جس کا جو مَوت کے بارے میں تصوّر ہوگا

مَوت ہی زندگیِ جاں کی گرہ کھولتی ہے
اِک کے بعد اِک نئے امکاں کی گرہ کھولتی ہے

زندگی حسن ہے اور حسن کی تکمیل ہے مَوت
حسن سے پہلے مگر عشق کی تشکیل ہے مَوت
عشق کے حسن میں ڈھل جانے کی تکمیل تلک
ایک تشکیل ہے تشکیل کی تفصیل ہے مَوت

مَوت کے حسن سے اب عشق کرو یا نہ کرو
تمھیں مرنا ہے بہر حال مرو یا نہ مرو

یا ڈرو مَوت سے تم یا نہ ڈرو مَوت تو ہے
عمر کی چاپ سنو یا نہ سنو مَوت تو ہے
مَوت اِک ایسی حقیقت ہے جو شیریں ہے نہ تلخ
وہ گرے تم پہ کہ تم اُس پہ گرو مَوت تو ہے

مان لو مَوت نے ہی پیدا کیا ہے تم کو
زندگی نے تو فقط مُردہ کیا ہے تم کو

عشق کر اِس سے کہ بس عشق کے قابل ہے یہ مَوت
حسرتِ قیس ہے یہ لیلیِ محمل ہے یہ مَوت
تُو نے ہی آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا اِس کو
تُو ہی غافل ہے کہ تجھ سے کہاں غافل ہے یہ مَوت

تُو ہے گر موج تو اِک بحر کی ہلچل ہے یہ
نا مکمّل ہے تُو اور حسنِ مکمل ہے یہ

مَوت مَیں کو بھی زمانے کو بھی تُو کو بھی ہے
مَوت ساقی کو بھی مے کو بھی سبو کو بھی ہے
جس نمو سے ہوئے ظاہر یہ عدم اور یہ وجود
قسم اُس کی کہ یہاں مَوت نمو کو بھی ہے

خامشی کو بھی یہاں مَوت ہے یاں صَوت کو مَوت
مَوت کہتی ہے کہ آئے گی یہاں مَوت کو مَوت

مَوت ہے مَوت پہ روتی ہوئی بلبل کو بھی
مَوت ہے باغ کو شبنم کو بھی اور گل کو بھی
ہستیِ قطرہ ہے کیا بحر کی ہستی ہے کیا
مَوت ہے جزو کو بھی مَوت ہے یاں کُل کو بھی

یعنی یہ مَوت اضافی بھی ہے مطلق بھی ہے
مَوت ویرانیِ بازار بھی رونق بھی ہے

مَوت تعمیر کو تعمیر کی حسرت کو بھی ہے
مَوت ہے کام کو بھی مَوت کہ فرصت کو بھی ہے
مَوت کے آگے ہیں سب ایک جدید اور قدیم
مَوت جدّت کو بھی ہے مَوت قدامت کو بھی ہے

جس طرح خامشی کو صوت لیے پھرتی ہے
زندگی کو بھی یہاں مَوت لیے پھرتی ہے

مَوت تکلیف کو ہستی کو بھی راحت کو بھی ہے
مَوت منزل کو مسافر کو مسافت کو بھی ہے
ڈر کے گر مَوت سے لے کوئی قیامت میں پناہ
کیا قیامت ہے یہاں مَوت قیامت کو بھی ہے

ہر جزا کو بھی ہے ہر ایک سزا کو بھی ہے مَوت
بے خطائی کو بھی یاں مَوت خطا کو بھی ہے مَوت

مَوت کثرت کو بھی ہے مَوت کہ وحدت کو بھی ہے
ہے کثافت کو بھی اور مَوت لطافت کو بھی ہے
مَوت آتش کو بھی ہے آب کو بھی خاک کو بھی
مَوت فطرت کی نمائش کو بھی فطرت کو بھی ہے

مَوت ہی رکھتی ہے سر گرمِ سفر فطرت کو
مَوت کو سمجھو سمجھنا ہے اگر فطرت کو

فطرت تو ہے معصوم نہ ہابیلؑ نہ قابیل
فطرت میں نہ عزت ہے نہ فطرت میں ہے تذلیل
یعنی ہے کوئی فعل نہ مفعول نہ فاعل
حاکم ہے نہ محکوم نہ ہے حکم نہ تعمیل

فطرت نہ کوئی شر نہ کوئی خیر ہے فطرت
بیگانۂ خطِ حرم و دیر ہے فطرت

فطرت میں کوئی نیک نہ فطرت میں کوئی بد
فطرت میں کوئی جرم نہ فطرت میں کوئی حد
تعمیر نہ تخریب نہ بکھراؤ نہ ترتیب
رَد ہے کوئی فطرت میں نہ فطرت میں کوئی کد

فطرت میں نہ بالا ہے نہ ہی پست ہے کوئی
حقّا کہ کوئی نیست ہے نے ہست ہے کوئی

فطرت میں کوئی گُل ہے نہ فطرت میں کوئی خار
انسان نے خود آپ بنائے ہیں یہ معیار
نے صید ہے فطرت میں نہ صیاد ہے کوئی
آزاد ہے فطرت میں کوئی اور نہ گرفتار

فطرت کو بشر نے نگہِ غیر سے دیکھا
جب دیکھا کسی شر سے کسی خیر سے دیکھا

فطرت میں نہ آغاز نہ فطرت میں ہے انجام
فطرت میں تھکاوٹ ہے نہ فطرت میں ہے آرام
بیداری و خوابیدگی سے دور ہے فطرت
فطرت میں کوئی صبح نہ فطرت میں کوئی شام

نے خامشی فطرت ہے نہ ہی صوت ہے فطرت
فطرت نہ حیات اور نہ ہی مَوت ہے فطرت

فطرت میں نہ مشکل ہے نہ فطرت میں سہولت
ہٹ ہے نہ کوئی ٹیڑھ کوئی حیل نہ حجت
کیا اور یہ کیوں ہی لیے بیٹھا ہے یہ انساں
سمجھا ہے کہ اس اسم سے کھُل جائے گی فطرت

فطرت میں نہ یہ کیا ہے نہ فطرت میں یہ کیوں ہے
فطرت تو مسلسل ہوئے جانے کا فسوں ہے

انسان کے ہاتھوں ہی یہ فطرت ہوئی دو نیم
ہاں خیر میں ہاں شر میں یہ فطرت ہوئی تقسیم
رحماں ہوئی فطرت کبھی شیطاں ہوئی فطرت
فطرت کی اُسے دو ہی طرح سے ہوئی تفہیم

انساں نہ بڑھا موسیٰؑ و فرعون سے آگے
رستہ ہے کھلا موسیٰؑ و فرعون سے آگے

فطرت کا قیام اور ہے فطرت کا سفر اور
درکار ہے فطرت کے پرکھنے کو نظر اور
اے چشمِ تضاد آئے گا یوں تجھ کو نظر کیا
یہ شام و سحر اور ترے شام و سحر اور

فطرت سے نہ رکھ بیر کہ یہ غیر نہیں ہے
اے چشم تجھے کیا طلبِ سیر نہیں ہے

فطرت میں نے عجلت ہے نہ فطرت میں ہے تاخیر
کرنے میں نہیں ہونے میں فطرت کے ہے تسخیر
فطرت کوئی مدّت ہے نہ میعاد نہ عرصہ
فطرت نہ کوئی خواب کوئی نیند نے تعبیر

نے ٹھوس ہے نے گیس نہ سیّال ہے فطرت
کیفّیتِ یک لذّتِ انزال ہے فطرت

ہاں اے شعورِ صاحبِ دل صاحبِ دماغ
فطرت کی تیرگی سے مبارز طلب چراغ
فطرت کو جاننے کی لگن میں بہ ایں ہمہ
جانے دیا نہ ہاتھ سے تو نے کوئی سراغ

سائے کی طرح وقت ترے ساتھ لگ گیا
اِک صفر اِس سفر میں ترے ہاتھ لگ گیا

اِک صفر ہے کہ جس کے مساوی ہے کائنات
اِک صفر ہے کہ جس پہ کھڑی ہے شماریات
یعنی یہ صفر و وقت و حرارت کی ہر اکائی
بنیاد ہیں برائے عروجِ ترقّیات

مفروضہ ہر اکائی جو ذہن بشر کی ہے
رفتار روشنی کی کہاں ہے صفر کی ہے

سب فرض کردہ ہے تو ہوا یہ جہاں بھی فرض
یعنی زماں بھی فرض ہوا اور مکاں بھی فرض
پیمائشیں بھی فرض ہیں سب فرض اکائیاں
کیا اور کیوں بھی فرض نہیں اور ہاں بھی فرض

جب سب ہی فرض کردہ اکائی کا پھیر ہو
پر کچھ عجب نہیں کہ عمارت یہ ڈھیر ہو

ہونے سے صفر کے ہیں حدود اور لا حدود
مانا کہ لا حدود بجا اور بجا حدود
نکلے ہو صفر لے کے جو تسخیر کے لیے
اِس رہ میں لا حدود ہیں کیا اور کیا حدود

یہ حدِّ صفر اور ہے یہ کائنات اور
یہ صفرِ بے ثبات الگ یہ ثبات اور

بے ابتدا ہے، ہے بھی اگر ابتدائے صفر
لا انتہا ہے، ہے بھی اگر انتہائے صفر
حیرت ہو ابتدا نہ کیوں حیرت ہو انتہا
کیوں اور کیا بنے ہیں جو وجہِ بنائے صفر

بے ابتدا جو خود ہو وہ کیا ابتدا بتائے
لا انتہا جو خود ہو وہ کیا انتہا بتائے

سائنس کا قلی ہے بہت زار و ناتواں
وزن اس پہ اپنی آرزوؤں کا کہ الاماں
ایجاد کی سواری ہے گرچہ رواں مگر
کوئی نہیں ہے کوئی نہیں اُس کا کوچواں

بے سمت ہے یہ سمت کدھر جا رہے ہیں ہم
لے جارہا ہے صفر جدھر جارہے ہیں ہم

کیا جانیے ہو ختم کہاں یہ خرد کا وہم
کب صفر کے حدود سے نکلے بشر کا فہم
صدیوں کے اِس سفر کو بھلا کیسے رد کرے
آتا ہے اِس مسافرِ خستہ پہ مجھ کو رحم

رَو میں ہے رَخشِ علم تھمے تو کہاں تھمے
آخر خرد کا پاؤں جمے تو کہاں جمے

جتنی بھی صفر میں تھی کرامت وہ ہو چکی
تسخیر جتنی ہونی تھی فطرت وہ ہو چکی
قدرت مزید صفر سے حاصل نہ ہوگی اب
ہونا تھی صفر کی جو بدولت وہ ہوچکی

ہونے پہ داد اور نہ فریاد چاہیے
اے خوف پھر نئی کوئی ایجاد چاہیے

اے خوف کوئی حُسنِ دِگر لا ظہور میں
شعلہ جو بن سکے وہ شرر لا ظہور میں
اے خوف پھر نئی کوئی حجّت تلاش کر
پھر اِک اگر پھر ایک مگر لا ظہور میں

بوڑھے یقیں کو شک کی جوانی کا حسن دے
پھر اِس جمودِ یم کو روانی کا حسن دے

اے خوف دے زماں کو نئے معنیِ زماں
ملبے سے اُٹھ نیا کوئی تعمیر کر مکاں
تکرارِ آب و خاک سے وہ گل کھلا جو گل
بیگانۂ بہار ہو بیگانۂ خزاں

وہ گل جسے نہ لُو نہ صبا سے ہو کچھ عرض
مطلق فنا سے ہو نہ بقا سے ہو کچھ غرض

تنہائی

بزم میں عقل کی تنہائی کا دَر کھلتا ہے
یعنی اِک طائرِ پرَ بستہ کا پَر کھُلتا ہے
جس کی پہنائی کو یہ چادرِ افلاک ہے کم
پاؤں چھپتے ہیں جو چادر میں تو سَر کھلتا ہے

یہ وہ ذرّہ ہے کہ جس کے لیے صحرا بھی ہے تنگ
یہ وہ قطرہ ہے کہ جس کے لیے دریا بھی ہے تنگ

عشق کیا جانے بھلا عقل کی تنہائی ہے کیا
خواب پر کیسے کھلے اصل کی تنہائی ہے کیا
عالمِ وصل میں ہے عشق تو گم کردۂ ہوش
عقل ہی جانتی ہے وصل کی تنہائی ہے کیا

عقل کو راز جو پانا تھا اسے پا بھی گئی
گرم بستر رہا اور کر کے وہ سیر آ بھی گئی

عقل حیرت ہے تماشے کو نگہ کھولتی ہے
عقل تدبیر ہے ذرّات کی تہہ کھولتی ہے
خیرگی کا عجب عالم ہے کہ نظارے پیچ
بند کرتی ہے جو گہ چشم تو گہ کھولتی ہے

کبھی تہہ میں ہے سمندر کی خلا میں ہے کبھی
تجربہ گہ میں گم اجزائے ہوا میں ہے کبھی

عقل تنہائی کا انجام بھی آغاز بھی ہے
عقل خود راز بھی ہے پردہ درِ راز بھی ہے
عقل ہی جانتی ہے عقل کا عالم کیا ہے
یہ خموشی بھی ہے پردہ بھی ہے آواز بھی ہے

عقل ہی سے تو کھلا ہے سرِ دل رازِ شہود
عقل ہی نے تو دکھایا ہے یہ سب رنگِ وجود

عقل تنہائی میں اِک عالمِ ھُو رکھتی ہے
مئے عرفاں سے لبالب یہ سبو رکھتی ہے
عشق حیراں ہے جہاں یہ ہے وہاں آئینہ
یہ عجب طرح کا اعجازِ نمو رکھتی ہے

عقل حق ہے کہ یہ شبہات کی رہ سے گزری
جس تلاطم میں گئی مَوت کی تہہ سے گزری

عقل کیا شے ہے کہاں ہے یہ نہیں ہے معلوم
وہ یقیں ہے کہ گماں ہے یہ نہیں ہے معلوم
رہیے خاموش کہ یہ بات تو تہہ در تہہ ہے
وہ نہیں ہے کہ وہ ہاں ہے یہ نہیں ہے معلوم

رمز کتنے ہی ہیں پوشیدہ نہیں میں ہَے کے
رنگ شے میں نظر آتے ہیں سبھی لاشَے کے

نہیں ملبوس کوئی عقل کی عریانی کا
حیرتی آئنہ ہے عقل کی حیرانی کا
عقل ہی وہ متجّس ہے وہ بینا ہے کہ بس
جس کو ادراک ہے اِس عالمِ امکانی کا

عقل ہی ہے کہ جو ہونے کی خبر لاتی ہے
ڈوبتی ہے مگر ایسے کہ ابھر آتی ہے

نجم و شمس و قمر و زہرہ و افلاک ہیں کیا
لالہ و گل کے تماشے یہ سرِ خاک ہیں کیا
کیا ہے برسات خزاں کیا ہے بھلا کیا ہے بہار
کیا ہیں یہ کوہ و دمن یہ خس و خاشاک ہیں کیا

عقل پر اپنی ہی دانائی کھلے تب یہ کھلیں
جب خداوند کی تنہائی کھلے تب یہ کھلیں

جب خداوند نے تنہائی سے کاڑھا یہ مکاں
تھا نہاں نور جو ظلمت میں ہوا کُن سے عیاں
اپنی تنہائی سے جس عشق نے پائی تھی نمود
حسن سے اس کے ہوا آئینہ خانہ حیراں

عشق جب حُسن ہوا عالمِ تنہائی تھا
جو تماشا تھا وہی آپ تماشائی تھا

میں سے جب تو ہوا وہ حُسنِ وجود و موجود
ہیبتِ حسن سے اِک خلق ہوئی سر بہ سجود
جو نہ جھپکی کبھی آئینے کی حیرانی میں
اُسی مژگاں پہ ہے اِک قطرۂ عشقِ معبود

نہ یہ مژگاں سے نہ یہ عالمِ امکاں سے اُٹھا
بار یہ وہ ہے کہ بس دامنِ یزداں سے اُٹھا

آئنہ خانہ ہے کچھ اور پسِ بود و نبود
ایک قطرہ کہ ہے موجود مگر نا موجود
بحر میں ہے تو یہ ہے بحر گہر پھر بھی نہیں
ہاں جدا بحر سے رہنا ہی ہے قطرے کا وجود

یہ تماشا پسِ دیدارِ نظر ہوتا ہے
قطرہ تنہائی سے گزرے تو گہر ہوتا ہے

دیکھ سکتی ہے فقط عقل یہ منظر تنہا
ذرّۂ ریگ ہے صحرا کے برابر تنہا
جسم سے کیا تلے تنہائی جو یکساں ہو وجود
جتنا قطرہ ہے، ہے اتنا ہی سمندر تنہا

بے خبر ہونا کہ خود آپ خبر ہو جانا
عشرتِ قطرہ ہے قطرے کا گہر ہو جانا

ایک جیسی ہی ہے خاموشی و غل کی تنہائی
جیسی ہے باغ کی ویسی ہی ہے گل کی تنہائی
عقل اِس طرح سے حیراں ہے سرِ آئینہ
جیسے آتی ہو نظر جزو میں کل کی تنہائی

شاخ ہو برگ ہو گل ہو کہ ہو شبنم کا وجود
سب کی تنہائی ہے تنہائی عالم کا وجود

یہی تنہائی تو کرتی ہے خموشی سے کلام
خامشی پردہ درِ رازِ مے و مینا و جام
خامشی سینۂ ساقی میں ہے سّرِ ازلی
خامشی سے نہ ہو آگاہ تو تنہائی ہے خام

خامشی سنتی ہے آوازِ تغیر شب و روز
اِس سے تنہائی میں پیدا ہے تحیر شب و روز

بس کہ تنہائی سے اِس دہر میں ہے قیمتِ چشم
ابھی نظّارے نے دیکھی ہے کہاں قامتِ چشم
ڈوب کر آتشِ نمرود کی تنہائی میں عشق
عقل بن کر ابھر آتا ہے پسِ حیرتِ چشم

عقل کرتی ہے مگر عشق کے لہجے میں کلام
دل نہ سمجھے تو ابو جہل سمجھ لے تو امام

عقل کرتی ہے پسِ آئنہ حیرت میں قیام
جیسے کثرت نے کیا حسن کی وحدت میں قیام
عقل رکھتی ہے فقط ذات میں یہ علمِ وجود
حسن کرتا ہے یہاں قالبِ فطرت میں قیام

دل کو تھامے ہوئے یہ آنکھ جدھر جاتی ہے
حیرتِ عقل کو تنہائی نظر آتی ہے

چہرۂ ذات کی تنہائی سے تشکیل ہوئی
ایک تنہائی کہ تنہائی میں تحلیل ہوئی
چشم میں ایک ہوا عالمِ بیداری و خواب
دیکھ اے حسن کہ تنہائی کی تکمیل ہوئی

جاگنا چشم کا اب عشق ہے سونا بھی ہے عشق
یعنی ہونا بھی ہے عشق اور نہ ہونا بھی ہے عشق

سرِّ تنہائی رہ ذات میں ہے سرِّ الہٰ
عقل کو جس نے دکھائی ہے تجسس کی راہ
حسن یوں عشق کی تنہائی میں کرتا ہے قیام
شعلۂ شمع میں جیسے ہو نہاں دودِ سیاہ

عشق تنہائی ہے تنہائی کا آغاز ہے حسن
کیا کہوں عشق کے زنداں کا درِ باز ہے حسن

یوں تو ہے ایک زمانہ یہاں سودائیٔ حسن
جان سکتا ہے فقط عشق ہی تنہائیٔ حسن
ہے کوئی محرمِ رازِ قدح و میخانہ
خلوتِ عشق ہے جلوت گہِ پیدائیِ حسن

یہ وہ تنہائی کہ جلوت یہی خلوت بھی یہی
ذات میں آئینۂ کثرت و وحدت بھی یہی

اِسی تنہائی سے ملتا ہے عدم کو بھی وجود
جیسے شعلے کے حجابات میں ہے جلوۂ دود
چشم و دل بیچ عجب عالمِ حیرانی ہے
نہ تو تنہائی ہے محدود نہ جلوہ محدود

چشم نے عالمِ تنہائی میں یاں تک دیکھا
دل سے اُس جلوۂ صد رنگ کو جاں تک دیکھا

اِسی تنہائی سے ہوتا ہے ظہورِ ہستی
نارِ ہستی بھی یہی ہے یہی نورِ ہستی
یہی تنہائی سمجھتی ہے تغیر کی زباں
اِسی تنہائی میں پنہاں ہے شعورِ ہستی

یوں ہی تنہائی میں چشمِ نگراں جاگتی ہے
پردۂ گُل میں کہ جس طرح خزاں جاگتی ہے

بس کہ تنہائی اُٹھاتی ہے حجابِ تنہائی
ہے لیے حسنِ ازل رُخ پہ نقابِ تنہائی
حرف در حرف لیے معجزۂ علم و کلام
دل کی تنہائی پہ اتری ہے کتابِ تنہائی

درِ تنہائی جو تنہائی پہ یاں باز ہوا
عالمِ عشق میں تخلیق کا آغاز ہوا

قیس سے پوچھ کہ تنہائیِ محمل کیا ہے
جو دھڑکتا نہیں تنہائی میں وہ دل کیا ہے
کیا ہے تنہائیِ یک حسرتِ دیدار کا ضعف
سِل جو رکھی ہے دلِ عشق پہ وہ سِل کیا ہے

زردیِ رخ میں بتائے گی کہ تنہائی ہے کیا
دل سے جاں تک جو ہے اس زخم کی گہرائی ہے کیا

جس کو اندازہ ہو افلاک کی تنہائی کا
اس پہ کھُلتا ہے فسوں ذات کی گہرائی کا
کون لاتا ہے خبر دل کی بجز تنہائی
ورنہ باہر تو بہت شور ہے پہنائی کا

شور میں کون و مکاں کے یہی کنجِ دل ہے
کس کو معلوم یہ تنہائی ہے یا محفل ہے

سر پہ تنہائی کے ہے کوچۂ آفاق کی خاک
کہ یہ ہے دل پہ اُٹھائے ہوئے بارِ افلاک
طوف میں کوچۂ آفاق کے ہے شام و سحر
چاہتی ہے اِسے ہونے کا ہو اپنے ادراک

اپنے ہونے سے یہ تنہائی دگر ہوتی ہے
دیکھیں تنہائی کو کب اپنی خبر ہوتی ہے

پردۂ ذات اُٹھاتی ہے تو یہ تنہائی
عقل کو راہ دکھاتی ہے تو یہ تنہائی
آئنہ خانۂ ہستی میں پسِ بود و نبود
دل کو آئینہ بناتی ہے تو یہ تنہائی

اس کی حیرت سے مسلسل ہے بہت حیرتِ دل
دیکھ آئینہ در آئینہ ہے یہ صحبتِ دل

دشت ہو گھر ہو سماتی نہیں تنہائیِ دل
راز تنہائی کا پاتی نہیں تنہائیِ دل
آپ سے کیا ہوئی رخصت کہ بہت عمر ہوئی
آپ میں لوٹ کے آتی نہیں تنہائیِ دل

بارِ تنہائی یہ تنہائی اُٹھائے کب تک
خبرِ بے خبری دل کو سنائے کب تک

وہ ہے تنہائی جنوں سے جو کرے کارِ شعور
وہ ہے تنہائی جو سینے میں رکھے شعلۂ طور
آپ مرکز ہو پسِ آئنۂ قرب و بعید
ہو کے خود آپ میں گُم غیب سے پاتی ہو حضور

جس کی خلوت ہو فزوں انجمن آرائی سے
کاڑھ لیتی ہو جہاں تنگیِ تنہائی سے

اِسی تنہائی سے ہوتا ہے محمدؐ کا ظہور
جس کا قامت حدِ امکاں ہے اُسی قد کا ظہور
جس کے ہونے سے چمک مہر میں ہے پھول میں رنگ
معدنِ حق کے اُسی لعل و زبر جد کا ظہور

جس کی تنہائی سے یہ انجمن آباد ہوئی
جس کی تنہائی میں گم ساعتِ ایجاد ہوئی

پوچھے مندوبِ اِلٰہ سے کوئی ''لاَ'' کی تنہائی
جس پہ گزری ہے یہاں کُنجِ حرا کی تنہائی
چشم کب ہوگئی دل عشق کو معلوم نہیں
عشق تو جاں پہ سنبھالے تھا بلا کی تنہائی

نہ کوئی ہوش کا عالم تھا نہ مدہوشی تھی
چشم جب دل ہوئی اِک راز کی خاموشی تھی

جس کی تنہائی سے پیدا سحر و شام ہوئے
جس کی تنہائی سے سیّارے سبک گام ہوئے
جس کی تنہائی کے شعلے میں کچھ ایسی تھی چمک
سامنے آئے مہ و مہر تو وہ خام ہوئے

جس کے ہونے سے ادا گُل میں نوا بلبل میں
جس کے ہونے سے ہے رَو عالمِ جزو وکل میں

جس کی تنہائی کا انجام نہ کوئی آغاز
جس کی تنہائی کا کھولا نہ گیا عقل سے راز
جس کی تنہائی انالعقل کا ہے نعرۂ مست
کیسے پہنچے گا بھلا اُس کی حقیقت کو مجاز

جس کی تنہائی کو تنہائی نہیں پاسکتی
ڈوب جائے بھی تو کیا تہہ تو نہیں لاسکتی

جس کی تنہائی کا عالم وہ یمِ لا محدود
اِک سِرا جس کا عدم ایک سِرا جس کا وجود
اصل تنہائی کا اِک نقطہ ہے جس کی تنہائی
جس کی تنہائی میں گم شاہد و مشہود و شہود

جس کی تنہائیِ بے فصل کی کوئی نہیں حد
اِک سِرا جس کا ازل ایک سِرا جس کا ابد

جس کی تنہائی ہے ہنگامۂ بزمِ امکاں
جس کی تنہائی ہے یاں محرمِ صد رازِ نہاں
ایک مرکز پہ دل و ذہن کو لانے کے لئے
جس کی تنہائی نے دی ذات کے کعبے میں اذاں

جس کی تنہائی پہ یاں سورۂ کوثر اترا
جیسا تھا حسنِ صدف ویسا ہی گوہر اترا

جس کی تنہائی پہ تنہائی کا عالَم ہے تمام
جس کی تنہائی بنی حاملِ وحی و الہام
دست بستہ رہا تنہائی میں جس کی سورج
جس کی تنہائی کے دربار میں حاضر رہی شام

جس کی تنہائی سے گردش میں زمیں ہے ہر دم
مہر کو جس جگہ ہونا تھا وہیں ہے ہر دم

جس نے جھیلی ہے اکیلے یہاں سب کی تنہائی
حرف کی نطق کی آواز کی لب کی تنہائی
جس کی تنہائی پہ بس ختم ہے تنہائی کا بار
جس کی تنہائی سے آگے تو ہے رب کی تنہائی

جس کی تنہائی کہ ہونے کی خبر سے گزری
شام سے جلتی ہوئی آئی سحر سے گزری

جس کی تنہائی کا عالم نہیں اشیا سے عیاں
لالہ و گل سے نہ ہی وسعتِ صحرا سے عیاں
جس کی تنہائی ہے تنہائی در اندر تنہائی
نہ ہی قطرے سے عیاں ہے نہ ہی دریا سے عیاں

جس کی تنہائی ہے یاں چہرۂ تنہائیِ غیب
کس سے اُٹھتا ہے بھلا پردۂ تنہائیِ غیب

مردہ بکری سے دے دنیا کے جو ہونے کی مثال
نفی در نفی ہے جس ذات کے اثبات کا حال
جس کی تنہائی نے دیکھی ہے وہ بے معنویت
لا بہ لا گزرا جو ہر منظرِ دنیا سے کمال

دہرِ بے معنیٰ سے پیدا کیے معنیٰ جس نے
بہرِ اثباتِ اِلہ پہلے کہا ''لا'' جس نے

جس کی تنہائی سے برہم ہوئی بزمِ اصنام
جس کی تنہائی بنی قاطعِ تیغِ اوہام
جس کی قدموں کی دھمک سے ہلے ایوانِ کہن
جس کی ٹھوکر سے گرا تاجِ سرِ کہنہ نظام

کارواں کے لیے جس نے رہِ نَو تازہ کی
بجھ رہے تھے جو دِیے ان کی بھی لَو تازہ کی

اے شہِ عرش نشیں بادشہِ کون و مکاں
آج انسان مجسم ہے صدائے الاماں
اپنی ہی تیغ سے کٹ جائے گا انساں اِک دن
ہائے کہتے ہوئے یہ بات اٹکتی ہے زباں

اسلحے کا ہے وہ انبار کہ دم گھٹتا ہے
ایسی ہے تیزیِ رفتار کہ دم گھٹتا ہے

اسلحہ ساز مگر اسلحہ سازی میں ہے گم
عقل سینے پہ رکھے ہاتھ کھڑی ہے گم صم
اُس کی مرضی ہے کہ بس ایک وہی زندہ رہے
سانس لینے کو ترس جائیں یہاں میں اور تم

کیا بتائیں اُسے خاموشی ہے کیا صَوت ہے کیا
اسلحہ ساز کو معلوم نہیں مَوت ہے کیا

اس کی گردن پہ بھی تلوار یہ چل سکتی ہے
یہ زمیں اس کے بھی پیروں سے نکل سکتی ہے
ایک لغزش کے سبب ایک اشارے کے سبب
راکھ کے ڈھیر میں دنیا یہ بدل سکتی ہے

ایڑیاں پیروں میں اور دوش پہ سر ہے کہ نہیں
اسلحہ ساز کو کچھ اپنی خبر ہے کہ نہیں

اسلحہ امن کی ترتیب ہو یا جنگ کا نام
اب تو انسان یہاں آ ہی گیا زیرِ دام
اعتبار اب نہیں انسان کا باقی کچھ بھی
کوششیں ہوگئیں تخفیف کی ساری ناکام

اسلحہ اتنا ہے پر خوف کا عالم ہے وہی
وہی تنہائی ہے تنہائی کا ماتم ہے وہی

آج انسان کو تنہائی نے گھیرا ہے بہت
در و دیوار پہ آسیب کا ڈیرا ہے بہت
نہ ستارے ہیں نہ مہتاب نہ جگنو نہ چراغ
شب کی تنہائی ہے اور دُور سویرا ہے بہت

ڈر ہی لگتا ہے کہ عہدِ من و تُو توڑ نہ لے
خود سے گھبرا کے کہیں آپ ہی سر پھوڑ نہ لے

صفحۂ دہر پہ یہ یورپ و امریکہ و روس
آدمیّت کا لہو رنگ پہن کر ملبوس
آدمیّت کا علم ہاتھ میں لے کر اپنے
آدمیّت کا نکالے ہوئے پھرتے ہیں جلوس

زندہ قوموں کو یہ مفلوج بنا دیتے ہیں
بھیک کا ٹھیکرا ہاتھوں میں تھما دیتے ہیں

ایسی تنہائی ہے بازار میں ہُو بولتا ہے
لہو بِکتا ہے دکاں دار لہو تولتا ہے
وہ ہے بے رونقیِ شہر کہ ہائے ہائے
نہ کوئی گھر سے نکلتا ہے نہ در کھولتا ہے

ہے وہ عالم کہ ہے ہر ایک محلّہ ویراں
مسجد و مندر و درگاہ و کلیسا ویراں

دُور ہوتا ہی چلا جاتا ہے یاں فرد سے فرد
بانٹتا ہی نہیں یاں کوئی کسی کے دکھ درد
گھر میں زندان میں تمیز نہیں اب کوئی
لُو وہ چلتی ہے کہ ہے صحنِ چمن گرد ہی گرد

چشمِ گل دیکھ ذرا تو بھی تو عالم یاں کا
قطرۂ خُوں ہوا ہر قطرۂ شبنم یاں کا

پہلے تنہائی تھی جنّت سے بشر کی دوری
پھر یہ تنہائی تھی سرمائے کی اک مزدوری
دامِ تنہائی میں اب اپنے گرفتار ہے خود
اب تو دیکھی نہیں جاتی ہے وہ ہے مجبوری

جس کو قدرت نے خود اعزاز دیا برتر کا
اب وہ انسان ہے پرزہ کسی کمپیوٹر کا

چیختا ہے کہ مشینوں میں دبا جاتا ہے دل
وزن وہ دل پہ رکھا ہے کہ گھُٹا جاتا ہے دل
شعلۂ شامِ تغیّر سے ہر اِک جا ہر سُو
آگ کچھ ایسی لگی ہے کہ جلا جاتا ہے دل

ایک شعلہ یہاں بجھتا ہے یہاں جلتا ہے
جسم جلتا ہے مگر جسم کہاں جلتا ہے

جو گزرتی ہے مشینوں سے مگر کیسے کہے
خوں اگلتے ہوئے سینوں سے مگر کیسے کہے
یہ مکاں آگ کے شعلوں میں ہے گھِرنے والا
کہہ تو سکتا ہے مکینوں سے مگر کیسے کہے

یہی بہتر ہے کہ یہ بار لیے پھرتا رہے
حسرتِ سایۂ دیوار لیے پھرتا رہے

صبح دم گھر سے نکلنا تو پلٹنا سرِ شام
شام سے تا بہ سحر بس یونہی تکنا در و بام
جائے صحرا میں تو ہے دھول نہ لیلیٰ ہے نہ قیس
گھر میں آئے تو ہے دیوار پہ وحشت کا قیام

روئے اِس حال پہ کیا دیدۂ گریاں آخر
ہے کوئی عقل کی تنہائی کا پُرساں آخر

اپنے بیٹے الہام نوید کے لئے

میرے بیٹے مِری صدا تُو ہے
گریۂ شب ہُوں میں دعا تُو ہے

کیا کہوں تجھ سے میں کہ کیا تُو ہے
میرے الہام کی صدا تُو ہے

صبر کی عمر کا صلہ تُو ہے
شب سے کاڑھا ہوا دیا تُو ہے

میں کلیم اور مرا عصا تُو ہے
تُو ارادہ ہے حوصلہ تُو ہے

تیری صورت کا آئنہ میں ہوں
میری صورت کا آئنہ تُو ہے

دل ہوں مَیں اور تُو ہے ضربِ ھو
میں زباں ہوں تو مدعا تُو ہے

ہوں قضا جس تلاشِ سجدہ کی
وہ مرا سجدۂ ادا تُو ہے

اب تو میں بھی نہیں ہو اپنے پاس
بس مرے پاس رہ گیا تو ہے

دَر سے زہراؑ کے در پہ زہراؑ کے
جو لیا تُو ہے جو دیا تُو ہے

(الہام نوید کی آمد۔ 7 ستمبر، 10 رجب المرجب نظم کہی 22 اگست 2003ء)

اپنے بھتیجے علی عمیس کی ناگہانی مَوت پر

شعلوں میں جل گئی ہے جوانی عمیسؔ کی
بس راکھ ہی بچی ہے نشانی عمیسؔ کی

سب ہاتھ مَل کے رہ گئے اُس تیز رَو کے بعد
رو کے سے رُک سکی نہ روانی عمیسؔ کی

شہزادہ ساتھ لے کے وہ کردار مرگیا
اور رہ گئی ادھوری کہانی عمیسؔ کی

کہتا تھا وہ کہ جاؤں گا اک دن بنا بتائے
پر جیتے جی کسی نے نہ مانی عمیسؔ کی

اے زندگی حوالے کیا تُو نے مَوت کے
افسوس تُو نے قدر نہ جانی عمیسؔ کی

اے مَوت تُو نے جتنے میں ہائے خریدلی
اُتنی سبک نہیں تھی گرانی عمیسؔ کی

ہاؔنی نے اپنی جان تو دے دی عمیسؔ کو
اب زندگی بتائے گا ہاؔنی عمیسؔ کی

عابسؔ یہ جانتا ہے کہ اب ساری زندگی
آساں نہیں ہے یاد بھلانی عمیسؔ کی

ماں کا خیال بھائی کا غم گھر کی دیکھ بھال
ہے زندگی روشؔ کو بتانی عمیسؔ کی

جس ماں کے دل میں زخم تھے پہلے ہی لاشمار
ہے اُس پہ تازہ زخم نشانی عمیسؔ کی

کہتے ہیں کس کو حشر اُٹھانا ہوئی خبر
میّت پڑی جو مجھ کو اُٹھانی عمیسؔ کی

واللہ ناگہانی کسے کہتے ہیں نویدؔ
سننے کو رہ گیا تھا زبانی عمیسؔ کی

اپنے بالاج کے لئے

مَیں اپنے گزرے ہوئے کل کو آج میں دیکھ کے جیتا ہوں
یعنی اپنا سارا جیون بالاج میں دیکھ کے جیتا ہوں

میں نے پَر تیار کیے ہیں عُمر لگا کر اس کے لئے
اوّل و آخر اب اُس کو معراج میں دیکھ کے جیتا ہوں

دیکھتا ہوں میں کاہکشائیں اُس کے پاؤں سے لپٹے ہوئے
سیّاروں پر اُس کی حکومت تاج میں دیکھ کے جیتا ہوں

یعنی ہے آئندہ اُس کا کہتے ہیں یہ ماضی و حال
نئے زمانے کو مَیں اُس کے راج میں دیکھ کے جیتا ہوں

یونہی شام و سحر چندا سورج سورج پہلو پہلو
اک مستی میں موجیں کرتے امواج میں دیکھ کے جیتا ہُوں

زندگی کی آخری نظم

نثری نظمیں

محیط

سنو! میں وہی ہوں جس کے پیروں میں
کبھی سیاحوں والے جوتے تھے
جس کے سینے میں دھڑکتا لوہار کا دل
اور جس کے ہونٹوں پر ملاحوں والے گیت تھے
میرا آغاز
خشکیوں کو دیے جانے والے
سمندروں کے پہلے بوسے سے ہوا
یہ سمندر
جو میرے ظاہر کی طرح پُرشور ہے
میرا باپ ہے
یہ زرد ساحل
جو میرے باطن کی طرح چپ چاپ ہے
میری ماں ہے
اِسی سرائے آب و ِگل میں
ہم اور تم ملے تھے

پھر اپنے ہونے کی گواہی ڈھونڈنے نکلے
تو بچھڑ گئے تھے
تم سے بچھڑ کے میں نے
قوموں کے درمیان
ایک لمبا سفر طے کیا
میں نے دیکھا
کہ چالیس کالے سچ
ایک سفید جھوٹ اپنے کاندھوں پر اٹھائے
قوموں کے درمیان گزر رہے ہیں
سواب میں ڈرنے لگا ہوں اُن لوگوں سے
جواب تک دس سچ بول چکے ہیں
اور ہم
اُن کی سچائی کے معترف لوگ
اُن کے گیارہویں جھوٹ کے آگے
گردنیں خم کرنے کے علاوہ
کوئی راستا نہیں رکھتے
کہ مسیحائی کی سنداب صرف مردہ مسیحاؤں کی
قبروں کے نشان بتانے پر مل جاتی ہے

اور اُن جھوٹے مسیحاؤں کو اپنا نشان ظاہر کرنے
کیلئے
درکار ہوتی ہے
ایک سال کی مدت
سنو!
میرے سیاحوں والے جوتے گھس چکے ہیں
میرا رقیب میرے دل کی دھک دھک سے ٹیک
لگائے
صبح ہونے تک اُونگھتا رہتا ہے
پھر صبح کی سپیدی میں اُس کا وجود
اپنی کلاہ درست کرتا ہوا
ایک ٹیلے پر چڑھتا ہوا نظر آتا ہے
جہاں نیکیاں
اور عظمتیں
اس کی منتظر ہوتی ہیں
جبکہ میں
حسبِ معمول اپنے پتلون کی دائیں جیب میں
بہت سارا ہلدی کا لیپ

اور بائیں جیب میں
بہت ساری پٹیاں ٹھونستا ہوا
چل پڑتا ہوں اُس کھنڈر کی طرف
جہاں صبح کی پہلی کرن کے جگائے پر
آنکھیں ملتی ہوئی
سنگ بدست نفرتیں اور ملامتیں
میری منتظر ہوتی ہیں
سنو!
میرے سیاحوں والے جوتے گھس چکے ہیں
میری بادشاہت دنیا کی تیسری تباہ کاری سے
گزرنے والی
میرے جرنیل کی تلوار لہولہو ہے
اور میرے مبلغ کی زبان میں کیڑے پڑ چکے
ہیں
میں اپنے جرنیل کی بدولت
اِس کرّے پر عوام کا منتخب کردہ تھا
اور اپنے مبلغ کی بدولت
آسمانوں کا مبعوث کردہ تھا

سنو!

میرے سیاحوں والے جوتے گھس چکے ہیں
اِس سے پہلے کہ میرے ہونٹوں پر
ملاحوں والے گیت سو جائیں
میں تم سے ملوں گا وہیں
جہاں خشکیاں سمندروں کو بوسہ دیتی ہیں
اُسی سرائے آب وِ گل میں
ہم اور تم ملیں گے
اور اپنے بیٹوں میں
کسی کو قابیل نہیں بننے دیں گے

ظاہر ہوا میری ''میں'' سے ''تُو''

''تُو'' نے میری ''مَیں'' پیدا کی
میری میں نے روح پیدا کی
میری روح نے جسم پیدا کیا
میرے جسم نے تنفس پیدا کیا
میرے تنفس نے ہَوا پیدا کی
میری پیاس نے پانی پیدا کیا
میری بھوک نے رزق پیدا کیا
میری تنہائی نے کائنات پیدا کی
میری موت نے زندگی پیدا کی
میری فُرصت نے کام پیدا کیا
میرے تضاد نے رات اور دن پیدا کیے
میری جبلّت نے خیر و شر پیدا کیے
میرے پید و ناپید نے وجود و عدم پیدا کیے
میرے شکر و کُفر نے جنت و دوزخ پیدا کیے
میرے خوف نے بہادری پیدا کی
میرے صبر نے قہر پیدا کیا

میرے خلق نے رحم پیدا کیا
میرے رحم نے سخاوت پیدا کی
میری خاموشی نے زبان پیدا کی
میری زبان نے صدا پیدا کی
میری صدا نے گفتگو پیدا کی
میری یکتائی نے عقل پیدا کی
میری عقل نے لوح و قلم پیدا کیے
میرے حق نے عِلم پیدا کیا
میرے عِلم نے نقطہ پیدا کیا
میرے نقطے نے خط پیدا کیا
میرے ارادے نے عمل پیدا کیا
میری نیّت نے عدل پیدا کیا
میرے اندھیرے نے روشنی پیدا کی
میرے مزاج نے موسم پیدا کیے
میری بے نیازی نے فقر پیدا کیا
میرے نفس نے حلال و حرام پیدا کیے
میرے ذوق نے خوبصورتی و بدصورتی پیدا کی
میری دُعا نے اثر پیدا کیا

میری لاعلمی نے زخم پیدا کیا
میرے زخم نے مرہم پیدا کیا
میری نفی نے اثبات پیدا کیا
میری پرواز نے پَر پیدا کیا
میری ہاں نے نہیں پیدا کی
میری نہیں نے ہاں پیدا کی
میرے کبر نے ناشکری پیدا کی
میری ناشکری نے بےتوکلی پیدا کی
میری بےتوکلی نے طلب پیدا کی
میری طلب نے رسد پیدا کی
میری رَسد نے منڈی پیدا کی
میری منڈی نے مقابلہ پیدا کیا
میرے مقابلے نے فقدان وافراط پیدا کیے
میرے فقدان وافراط نے طبقات پیدا کیے
میرے طبقات نے ہوس پیدا کی
میری ہوس نے حرص وہوا پیدا کیے
میرے حرص وہَوا نے ظلم پیدا کیا
میرے ظلم نے کفر پیدا کیا

میرے کُفر نے طاغوت پیدا کیا
میری عاجزی نے غم پیدا کیا
میرے غم نے مظلومیت پیدا کی
میری مظلومیت نے تقویٰ پیدا کیا
میرے تقویٰ نے طہارت پیدا کی
میری طہارت نے زہد پیدا کیا
میرے زہد نے عبادت پیدا کی
میری عبادت نے شکر پیدا کیا
میرے شُکر نے نعمت پیدا کی
میری نعمت نے نور پیدا کیا
میری وحدت نے کثرت پیدا کی
میری کثرت نے وحدت پیدا کی
میرے غیاب نے حضوری پیدا کی
میری حضوری نے غیاب پیدا کیا
میرے یقین نے شک پیدا کیا
میرے شک نے یقین پیدا کیا
میری حقیقت نے وہم پیدا کیا
میرے وہم نے حقیقت پیدا کی

میری حقیقت نے مجاز پیدا کیا
میرے مجاز نے حقیقت پیدا کی
میرے اختیار نے جبر پیدا کیا
میرے جبر نے اختیار پیدا کیا
میری حیرت نے تجسس پیدا کیا
میرے تجسس نے جستجو پیدا کی
میری جستجو نے راہ پیدا کی
میری راہ نے سفر پیدا کیا
میرے سفر نے منزل پیدا کی
تب کہیں جا کے
ظاہر ہوا میری ''میں'' سے ''تُو''

نئی تعمیر کا خواب

گراؤ اِس عمارت کو

جسے

صدیوں نے اپنی گرد سے مخدوش کر ڈالا

یہ وہ دیوار ہے جو سر بلندی کی علامت تھی

اور اب یہ ہے

کہ اِس دیوار سے سر ٹیک کر خلقِ خدا

پیشاب کرتی ہے

یہ وہ چھت ہے جو ہم کو خوف کے آسیب سے
محفوظ رکھتی تھی

اور اب یہ ہے

کہ اِس پر

بلیّاں لڑتی ہیں راتوں کو

کئی سوراخ ہیں

جن کے دہانوں سے

نحوست نوعِ انساں کا

لہو بن کر ٹپکتی ہے

یہ وہ تالاب ہے
جس کے کنارے
گفتگو کرتی تھی اک خلقت
وضو کرتی تھی اک خلقت

اور اب یہ ہے
کہ اِس تالاب کے پانی میں
مینڈک ٹرٹراتے ہیں
یہ وہ کھڑکی ہے جو
افلاک کے آنگن میں کھلتی تھی

اور اب یہ ہے
کہ اِس کی چوکھٹوں سے بدنصیبی
مکڑیوں کے جال کی صورت میں لپٹی ہے
گراؤ اس نحیف و ناتواں پُرحول دہشت ناک

بوسیدہ عمارت کو
کہ اِس کی عمر پوری ہو چکی کب کی
مگر یہ کیا
غنیمِ شہر پر
ہمراہِ وحیِ تازہ

امریکی خدا نے
اک نیا جبریل بھیجا ہے
کہا ہے
ہمارے دیوتا کا تم پہ سایا ہے
سو بے خوف و خطر
تلوار کے بل پر
عوام الناس سے کہہ دو
کہ اِس ویراں کھنڈر پر
رنگ و روغن کر دیا جائے
اُدھڑتے فرش کے سب داغ دھبے
حق پرستوں کے لہو سے دھو دیے جائیں
عمارت کی مرمّت
اس طرح کی جائے
سارے عیب چھپ جائیں
غنیمِ شہر پر یہ حکم آتے ہی
نکل آئے ہیں غاروں سے
وہ سب مُلا
کہ جو مصروف تھے بلّی پکڑنے میں

اب اُن کے ہاتھ میں
تسبیح کے بدلے تگاری ہے
وہ سارے سورما ہاتھوں میں اپنے
جبر کی کرنی لیے
مصروف ہیں پیوندکاری میں
کہ جن کی وردیاں تمغے
کماں بردوش دشمن کے
عجاعب گھر کی زینت ہیں
یہ سب مکّاریہ بوسیدگی کو لیپنے والے
رکاوٹ ہیں نئی تعمیر کے رستے میں صدیوں
سے
مگر یہ بے خبر ہیں اُس گھڑی سے
جب لرزتی ، بیٹھتی ، دھنستی
عمارت کے
کسی گرتے ہوئے شہ تیر کے نیچے
اِنھی کی مائیں ، بہنیں ، بیٹیاں ، بچے
سبھی دب جائیں گے اِک دن
میرے محنت کشو

میرے جوانو
طالبِ علمو
کسانو
میرے دہقانو
وکیلو
جرنسلٹو
میں اب اُکتا چکا ہوں
سو اب میری بلا سے
مرے ہمراہ تم بھی
اِس عمارت کو گراؤ
یا اِسی میں دفن ہو جاؤ

”ھُو“ کی بستی

”کہتے ہیں یہ بستی اُس وقت سے آباد ہے جب نہیں بھی نہیں تھا“

جہاں نہ ذات ہے نہ صفت ہے
جہاں نہ خالق ہے نہ مخلوق ہے
جہاں نہ توانائی ہے نہ مادّہ ہے
جہاں نہ صفر ہے نہ لا ہے
جہاں نہ جمع ہے نہ تفریق ہے
جہاں نہ تقسیم ہے نہ ضرب ہے
جہاں نہ زمان ہے نہ مکان ہے
جہاں نہ ارادہ ہے نہ فعل ہے
جہاں نہ ہابیل ہے نہ قابیل ہے
جہاں نہ رشک ہے نہ حسد ہے
جہاں نہ لالچ ہے نہ خوف ہے
جہاں جنت ہے نہ دوزخ ہے
جہاں نہ حاکم ہے نہ محکوم ہے
جہاں نہ زخم ہے نہ مرہم ہے
جہاں نہ درد ہے نہ دوا ہے

جہاں نہ موت ہے نہ حیات ہے
جہاں نہ حالت ہے نہ کیفیت ہے
جہاں نہ ''ہے'' ہے نہ ''نہیں'' ہے
جہاں نہ خواہش ہے نہ طلب ہے
جہاں نہ حرف ہے نہ بیان ہے
جہاں نہ خامشی ہے نہ کلام ہے
جہاں نہ نفی ہے نہ اثبات ہے
جہاں نہ معنویّت ہے نہ بے معنویّت ہے
جہاں نہ وجود ہے نہ عدم ہے
جہاں نہ ''مَیں'' ہے نہ ''تُو'' ہے
جہاں نہ بھوک ہے نہ پیاس ہے
جہاں نہ خشک ہے نہ تر ہے
جہاں نہ غضب ہے نہ شہوت ہے
جہاں نہ عقل ہے نہ حِس ہے
جہاں نہ سماعت ہے نہ بصارت ہے
جہاں نہ فراق ہے نہ وصال ہے
جہاں نہ خوشی ہے نہ غم ہے
جہاں نہ دن ہے نہ رات ہے

جہاں نہ ''کیوں'' ہے نہ ''کیا'' ہے

جہاں نہ حرف ہے نہ عدد ہے

جہاں نہ ہنسنا ہے نہ رونا ہے

جہاں نہ قربت ہے نہ دوری ہے

جہاں نہ ترتیب ہے نہ بے ترتیبی ہے

جہاں نہ جبر ہے نہ اختیار ہے

جہاں نہ ازل ہے نہ ابد ہے

جہاں نہ طوالت ہے نہ اِختصار ہے

جہاں نہ خیر ہے نہ شر ہے

جہاں نہ نُور ہے نہ طاغوت ہے

جہاں نہ وہم ہے نہ حقیقت ہے

جہاں نہ مرد ہے نہ عورت ہے

جہاں نہ اِسم ہے نہ جنس ہے

جہاں نہ روشنی ہے نہ اندھیرا ہے

جہاں نہ خزاں ہے نہ بہار ہے

جہاں نہ بلندی ہے نہ پستی ہے

جہاں نہ سَرد ہے نہ گرم ہے

جہاں نہ جُرم ہے نہ حَد ہے

جہاں نہ سزا ہے نہ جزا ہے
جہاں نہ آغاز ہے نہ انجام ہے
جہاں نہ کون ہے نہ کوئی ہے
جہاں نہ لوح ہے نہ قلم ہے
جہاں نہ کثرت ہے نہ وحدت ہے
جہاں نہ بغاوت ہے نہ بیعت ہے
جہاں نہ دیر ہے نہ حرم ہے
جہاں نہ تنہائی ہے نہ یکتائی ہے
جہاں نہ عبد ہے نہ معبود ہے

”کہتے ہیں یہ بستی اُس وقت سے آباد ہے جب نہیں بھی نہیں تھا“

''اور کیا ہوتا ہے عذاب آسمانی دیوتا کو جھٹلانے کا''

زمینی اور آسمانی بلاؤں میں گھری ساڑھے سات ارب انسانی آبادی
میں ایک کردار میں بھی تھا۔

اپنے لیے پہلا انسان خود ہونے کے ناطے
میں خود بھی اِس زمینی اور آسمانی بلاؤں کے طوفان سے نکلنا چاہتا تھا
اور ساتھ ہی اِس ساڑھے سات ارب انسانی آبادی کو بھی نکالنا چاہتا تھا
مگر یہ ساڑھے سات ارب انسانی آبادی
نہ تو مجھے اس زمینی اور آسمانی بلاؤں کے طوفان سے نکلنے دیتی تھی
نہ خود نکلنے کو تیار تھی
ان کا ایمان تھا کہ بادلوں کے گھوڑے پر سوار اُن کا آسمانی دیوتا آئے گا
اور اُن کو اِس زمینی اور آسمانی بلاؤں کے طوفان سے نجات دلائے گا
یہ وہی آسمانی دیوتا تھا
جس کا وہ پہلے کئی بار انکار کر چکے تھے

اوراب ِگڑ ِگڑا کراُس سے معافی مانگ رہے تھے

کہ اے آسمانی دیوتا ہمیں معاف کردے

ہم پر پھر رحم کر ہم جانتے ہیں

ہم نے تجھے بار بار جھٹلایا اور تو نے ہر بار ہمیں معاف کر دیا

کہ تو رحیم ہے کریم ہے

اے آسمانی دیوتا ہمیں بس معافی کا ایک موقع اور دے دے

اور ہمیں اِس زمینی اور آسمانی بلاؤں کے طوفان سے نکال لے

وہ آسمانی دیوتا کے انتظار میں اتنے سچے تھے

کہ اگر کوئی انسان اُنہیں اِس زمینی اور آسمانی بلاؤں کے طوفان سے نکلنے کی

کوئی تدبیر بتاتا تھا تو یہ اُسے مار دیتے تھے۔

میرے ساتھ بھی اِس ساڑھے سات ارب انسانی آبادی نے یہی کیا

کہ جب میں نے اِس زمینی اور آسمانی بلاؤں کے طوفان سے نکلنے کی تدبیر

نکال لی

تو اس ساڑھے سات ارب انسانی آبادی نے

یہ کہہ کر میرے ہاتھ پاؤں توڑ ڈالے
کہ کیا تم آسمانی دیوتا ہو
یا تم بادلوں کے گھوڑے پر سوار ہو کر آئے ہو
پھر ایک دن اچانک اِس زمینی اور آسمانی بلاؤں میں گھِری ساڑھے ساتھ
ارب انسانی آبادی نے دیکھا
کہ بہت سارے بادل آئے ہیں اور اُن بادلوں کے گھوڑے پر سوار آسمانی
دیوتا بھی آیا ہے
ساڑھے سات ارب انسانی آبادی نے بے تحاشا اُس کی سمت دوڑنا شروع
کر دیا
اور میں بے دست و پا ساڑھے سات ارب انسانی آبادی کے قدموں تلے
روندا گیا
اتنا پامال ہوا کہ میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے
پھر ساڑھے سات ارب انسانی آبادی نے دیکھا
کہ بادلوں کے گھوڑے پر سوار آسمانی دیوتا زمین پر اُتر آیا ہے
دہشت سے ساڑھے سات ارب انسانی آبادی آسمانی دیوتا کے سجدے میں
گر گئی
آسمانی دیوتا کے چہرے پر قہر نما جلال تھا

اُس کی آنکھوں سے خون جاری تھا
وہ میری لاش کے ٹکڑے چُن چُن کر جوڑ رہا تھا
اور خون کے آنسو بہا رہا تھا
آخرِ کار اُس نے مجھے جستہ جستہ جوڑ کر زندہ کر دیا
ساڑھے سات ارب انسانی آبادی آسمانی دیوتا کے سجدے میں گِری رہی
آسمانی دیوتا مجھے اپنی آغوش میں بھر کر بادلوں کے گھوڑے پر سوار ہوا
اور دُور کہیں آسمانوں میں غائب ہو گیا
ساڑھے سات ارب انسانی آبادی زمینی اور آسمانی بلاؤں کے اِس طوفان میں گھری کی گِھری رہ گئی
اور کیا ہوتا ہے عذاب آسمانی دیوتا کو جُھٹلانے کا۔

اِسے خلوت میں پڑھ تجھ کو اگر خلوت میسّر ہو
مکمل اپنی حیرانی کا دیواں کرلیا میں نے